غزلیاتِ اقبال

سر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

مرتبہ

سید ظہیر عباس رضوی

خیابان پبلی کیشنز

بمبئی ۹

© خیابان پبلی کیشنز، بمبئی ۹

بار اوّل : سنہ ۱۹۷۸ء

کتابت : محمد مشتاق حسین

طباعت : اجمل پریس، پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

تاریخ اشاعت : اگست سنہ ۱۹۷۸ء

قیمت : چھ روپے پچاس پیسے ۶/۵۰

ناشر : خیابان پبلی کیشنز

۱۰۵۔ نشان پاڑہ روڈ، دوسرا منزلہ

بمبئی ۴۰۰۰۰۹

ترتیب

۱۔ انتساب	.. ..	۴
۲۔ پیش لفظ	مرتب	۵
۳۔ اقبال اور غزل	رشید احمد صدیقی	۷
۴۔ غزلیاتِ اقبال	.. ..	۱۶ تا ۱۱۳

MAKTABA JAMIA LTD

والد مرحوم مولانا سید وزیر حسن واعظ

کی نذر ——— جن کی پاکیزہ اور

عالمانہ اندازِ فکر نے اپنے اور بیگانے

دونوں کو اپنا گرویدہ کرلیا۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

مجھے آپ کے سامنے "غزلیاتِ اقبال" کا یہ مجموعہ پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ یوں تو علامہ اقبال پر اب تک نہ جانے کتنا تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن آج بھی اقبال شناسی کا جام خالی ہی نظر آتا ہے۔ اقبال کے کلام کے نفسیاتی اور معاشرتی مطالعے پر گہری نظر کی ضرورت ہے۔ دنیا جسے تفریحِ طبع تصور کر کے وادیٔ فن کی پرخار روش سے بے بہرہ گذر جاتی ہے۔ وہیں پر اقبال انسانی لاشعوریت سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطروں سے شعر کی ایک تاریخ مرتب کرتا ہے۔

ضمیرِ انسانی کو آواز دینے والا یوں ہی حکیم الامت نہیں بنا بلکہ نصیحت کے چبھتے ہوئے تیروں کو اپنے خونِ جگر سے رنگین کیا ہے تاکہ یہ کسی اور کے خون سے اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ غلط ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے صرف مسلمانوں کو ہی بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سوچنا تنگ نظری کی علامت ہے۔ علامہ اقبال کے خیالات کو کسی مذہب کی آہنی زنجیروں میں جکڑا نہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی ملک کی جغرافیائی حدود تک محدود کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک عالم گیر آواز تھی۔ جہاں جہاں قوتِ سماعت تھی وہاں وہاں اثر انداز ہوئی ——

خود علامہ اقبال نے اس قسم کی تنقیدوں کی تردید کی ہے۔ ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"میری فارسی نظموں کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ میرا مطمعِ نظر ایک آفاقی، سماجی

بازتعمیر کی راہ روشن کرتا ہے اور سعی کے دوران میں میرے لئے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ناممکن ہو جاتا ہے کہ میں ایک ایسے سماجی نظام کو نظر انداز کر دوں جو وجود میں اسی لئے آیا کہ ذات پات رتبہ اور نسل کے تمام امتیازات مٹادے اور جو اس دنیا کے معاملات پر چشم نگراں رکھتے ہوئے بھی ایک ایسے ماورائی انداز فکر کی پرورش کرتا ہے جو انسانوں کے باہمی ربط کیلئے لازمی اور قطعی شرط ہے۔ اسی انداز فکر کی یورپ میں کمی ہے اور اسی کو وہ اب بھی ہم سے حاصل کر سکتا ہے۔"

علامہ اقبال کے نظریہ فکر پر روشنی ڈالنے کیلئے دو چار صفحات ناکافی ہیں۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جو آج بھی اہل علم کی نظرِ التفات کا محتاج ہے ——— میں یہ نہیں کہتا کہ اس موضوع پر کام نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے وہ اب بھی ناکافی ہے اور موضوع تشنہ ہے۔

علامہ اقبال کے شعورِ فن کے سلسلے میں جناب انور ظہوری کا جملہ لکھ کر اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں:

"اقبال کے شعورِ فن کو سمجھنے اور سمجھانے کی آج تک حقیقتاً کوئی
بھرپور کوشش کی ہی نہیں گئی ———"

(سیارہ، فروری مارچ ۷۸ء)

خیابان پبلی کیشنز، بمبئی ۹ کی یہ پہلی پیش کش ہے۔ امید ہے کہ آپ کی باریک بینی اس مجموعے کی خامیوں سے ہمیں مطلع کرے گی جس کے لئے ہم ممنون ہوں گے۔

آپ کا

سید ظہیر عباس رضوی

یکم اگست ۱۹۷۸ء

اقبال اور غزل

از رشید احمد صدیقی

اقبال کی ابتدائی غزلیں اور میرے خیال میں تو نظمیں بھی کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ کی زبان اور داغ کے کلام کی بڑی دھوم تھی۔ یہ دونوں باتیں اقبال کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں۔ اس لئے نہیں کہ اقبال آئندہ چل کر بڑے شاعر بننے والے تھے بلکہ اقبال نوجوان تھے۔ طبیعت شاعرانہ پائی تھی اور ان کا دیار اردو کی سحر کاریوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ لیکن اقبال کسی طرح داغ کی منزل پر دیر تک نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ جلد آگے بڑھ گئے اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ انھوں نے تمام عمر داغ کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ داغ کی منزل پر ٹھہر جانا کسی شاعر کے لئے کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ اقبال نے دراصل داغ سے زبان نہیں سیکھی بلکہ شاعری کی زبان کی اہمیت پہچانی۔ شاعری کے لئے اردو زبان اب اتنی پختہ اور آزمودہ ہو چکی ہے کہ کسی شاعر کا چاہے وہ کتنا ہی ہونہار کیوں نہ ہو، زبان سے بے تکلفی برتنا یا اس کے تقاضوں کو خاطر میں نہ لانا خود اس کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ اقبال کی غزل کی زبان اردو کے دوسرے غزل گویوں کی زبان

سے مختلف بھی ہے اور ناقابلِ تقلید بھی۔ اقبال کو اپنی غزل کے لئے نئے انداز کی زبان وضع کرنی پڑی۔ ایسی زبان کو غزل سے منسوالینا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ گو یہاں اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ غالب کے ہمراہ اس راستے کے بہت سے کانٹے نکل چکے تھے۔

اب ہمارے عام غزل گو شعراء خواہ وہ کسی مسلک یا مرتبہ کے ہوں کچھ اور نہیں تو وہ ایک آدھ شعر اقبال کے رنگ میں کہہ دینا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک کوئی بات اقبال کے رنگ میں پیش نہ کی جائے گی ان کا کلام یا وہ خود مقبولِ عام کی سند نہ پا سکیں گے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ غزل میں اقبال کا رنگ بنانا اقبال کے علاوہ کسی اور بے بس کی بات نہیں۔

اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگِ بنیاد ہے۔ غالب کے ہاں بھی دل و ذہن کا ماجرا ملتا ہے لیکن غالب کو یہ سہولت حاصل تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطہ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقدر رکھتے تھے جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے۔ یہ مقدر تھا اسلامی عقائد کی برتری اور اسلامی

اعمال کی برگزیدگی کا۔ اپنی شاعری میں اقبالؔ نے انھیں دو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اقبالؔ کی غزلوں میں ان تمام شکوک کی توجیہہ مل جاتی ہے جو ان کے نظریوں کا نتیجہ بتائے جاتے ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں کوئی چیز مجرّد نہیں ہے۔ حُسن ہو، عقل ہو، عشق ہو، مذہب ہو، زندگی ہو، آداب ہو، وہ سب کو باہم دگر مربوط و مستحکم دیکھتے ہیں۔ جزو میں یہ علیٰحدہ علیٰحدہ رکھے جا سکتے ہیں لیکن کُل میں یہ سب ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ بڑی شاعری میں منجملہ اور باتوں کے دو نہایت ضروری ہیں۔ ایک تو اس کا رشتہ کسی اعلیٰ اور عظیم حقیقت سے دوسرے اس کا ربط کسی اعلیٰ اور عظیم شخص اور شخصیت سے علم تلاشِ حقیقت ہے۔ شاعری جستجوئے انسانیت۔ بڑی سے بڑی کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جو انسان کے لئے نہ ہو۔ اقبال خدا کو سب سے بڑی حقیقت تصوّر کرتے ہیں اور رسالت مآب ؐ کو سب سے بڑا شخص اور شخصیت بڑی شاعری میں بڑے انسان کا ہونا لازمی ہے اور بڑا انسان سب سے بڑی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اقبالؔ کے فلسفے کی بنیاد اسی مقدّر پر ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ انھوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی بلکہ اپنے عقیدے

کو فلسفہ کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر یہ جامہ عقیدے کے جسم پر جہاں تہاں چست نظر نہیں آتا تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف نہیں آتا۔ عقیدہ یوں بھی فلسفہ کا دستِ نگر نہیں ہوتا۔ عقیدہ یقین ہے فلسفہ نہیں۔ یقین شخصی فلسفہ ہے۔ اقبال عظمتِ آدم اور عظمتِ فرد دونوں کے داعی ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق ہر شخص (فرد) بے پایاں ترقی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اسلامی عقیدہ اور عمل کا محور "کلمہ گیتی نورد" ہے۔ اسی لیے اسلام کا تصور قومی نہیں ہے جو آج کل سمجھا جاتا ہے۔ مختلف ٹولیوں میں رہنے سہنے کی انسان میں جو خواہش ہے وہ دراصل سلامتی جان و مال کی بنا پر ہے۔ تمدن کے ابتدائی دور میں یہ خواہش مفید تھی لیکن ترقی یافتہ زمانے میں اس کے خطرات مسلّم ہیں جس کے نتائج آج ہر طرف ظاہر ہو رہے ہیں۔

اقبال کو کمیونلسٹ (فرقہ پرست) بتایا جاتا ہے۔ جس دیار میں فرقہ پرستی عام ہو وہاں بڑی شاعری اور بڑے شاعر کا محور و مقصود ذہنوں میں نہیں آسکتا۔ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے مبلغ تھے۔ بعد میں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کے داعی بن گئے۔ اس طرح کبھی وہ

قوم پرست تھے بعد میں فرقہ پرست ہو گئے لیکن تنقید نگار یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کی منزلِ مقصود کیا تھی اور اس کے طے کرنے میں وہ کہاں سے کہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے، نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند!

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

نہ چینی و عربی نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

اقبال پر کمیونلزم کا اتہام رکھنے والے ان اشعار میں اقبال کی فکر و نظر کا

مطالعہ کریں۔ اقبال کی مانند بڑا شاعر کبھی فرقہ پرست نہیں ہو سکتا۔ ہمارے تنقید نگار اس نکتہ سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ بڑی شاعری کی سرحدیں کمیونزم سے نہیں انسانیت سے ملی ہوئی ہیں ـــــ مذہب کا حقیقی تصوّر حیات و کائنات کا بڑا تصوّر ہے اور ہر بڑی شاعری کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصوّرِ حیات و کائنات سے پھوٹتا ہے۔ یہ عظیم تصوّر اسلامی بھی ہو سکتا ہے، عیسوی بھی اور ہندو بھی۔ ان معنوں میں اسلامی ادب، ہندو ادب اور عیسائی مذہب ب کا قائل ہوں۔ بڑی شاعری کا ماخذ یوں بھی بیشتر مذہبی یا ماورائی رہا ہے۔

کسی شاعر یا شاعری میں منطق، فلسفہ، ریاضی اور سائنس کا ربط ڈھونڈنا اور نہ پانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ شاعری علم نہیں ہے بلکہ شاعر کے فکر، تخیّل، تاثر یا تجربہ کا انفرادی جمالیاتی اظہار ہے جو مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے۔ ان میں منطقی ربط نہ ہونا عیب نہیں، قرینِ فطرت ہے۔ شاعر انسان زیادہ رہتا ہے منطقی کم ـــــ اقبال کے مردِ مومن کا مولا صفت ہونا ان کے نظریہ خودی کے عین مطابق ہے۔

اقبال کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ انھوں نے زمانہ ایسا پایا تھا جب سائنس، ادب، فلسفہ، مذہب، قومیت، تجارت،

سیاست، سرمایہ داری سب کی سب زندگی کی نئی تقدیر سے دست و گریباں تھے اور کتنے سفینے اور ساحل اس کی زد میں آ کر پاش پاش ہو رہے تھے۔
اقبالؔ صرف شاعر نہ تھے مفکر بھی تھے۔ مسلمان بھی، مجاہد اور معلم بھی۔۔۔ ان کی شاعری میں ان تمام صفات کی جلوہ گری ملتی ہے تو کیا تعجّب۔۔۔
ظاہر بیں نظروں کو اقبالؔ کے یہاں تضاد ملتا ہے۔ لیکن اقبالؔ مسائلِ حیات کا حل خانوں میں نہیں تلاش کرتے تھے۔ بلکہ ایک گیتی نور و عقیدۂ رحمت و منزلت میں سوچتے تھے۔۔۔ اقبالؔ سے پہلے کوئی ایسا شاعر نہیں گذرا تھا جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے تقاضوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا کہ اقبالؔ نے۔۔۔ اقبالؔ ہمارے تمام شعراء سے زیادہ لکھے پڑھے تھے۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ علوم و فنون ہی کا نہیں۔ یزدان، انسان اور اہرمن سب ہی کا۔ ان کی نظر میں وہ تمام تہلکے اور تحریکیں تھیں جن سے زندگی دوچار تھی۔ اور انسانیت معرضِ خطر میں۔ ایسے وقت میں یا تو پیغمبر پیدا ہوتے ہیں یا شاعر۔ ہندوستان میں دونوں پیدا ہوئے۔ گاندھی اور اقبالؔ۔ اقبالؔ کی شاعری اور ان کے افکار کے سمت و رفتار کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ نے فن کے رموز، زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر، جذبہ اور تخیل کے مقامات پہچاننے میں کتنا ریاض کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں اور ان کے بعد ان پر اپنی ساری نعمتیں بھی تمام کر دی ہوں جیسے اردو شاعری کا دین اقبال پر مکمل ہو گیا ہو۔

اقبال کی نظموں میں غزل کی اور غزل میں نظموں کی خوبی اور خوشنمائی ملتی ہے۔ نظم کا زور اور غزل کی زیبائی۔ اقبال نے بڑی محنت، تلاش، تجربہ اور تراش خراش کے بعد اپنی غزل کے لئے ساز اور سلیقے بنائے۔ یہ ساز اور یہ سلیقے کسی دوسرے غزل گو کے بس کے نہیں۔ غالب کے بعد اقبال نے اردو شاعری کو فارسی سے ایک نئی محکمی بخشی اور فارسی کی فتوحات میں ایک قابلِ قدر اضافہ۔

اقبال کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں مثلاً رشک و رقابت۔ فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع و بدائع اور زبان و بیان کی نمائش جن کے بغیر غزل غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعرا اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل کو شعرا کی نہ زبان رکھی نہ موضوع، نہ لہجہ۔ بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع، تاثیر، شیرینی،

شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فردوِ فرزانگی اور دلاوری اور دلیری ملتی ہے جو مناظرِ قدرت اور صحتِ سماوی میں ملتی ہیں۔

اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچا دیا۔ انھوں نے غزل کو محفلِ سماع اور بزمِ ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقے میں پہنچا دیا۔ اقبال کی نظموں کا شباب اقبال کی غزلوں کی شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ عشق نے جاتی ہے جب تک ترکِ نسب نہیں کرا لیا اپنی حریم میں داخل ہونے نہیں دیا۔ یہی حال غزل کا ہے۔ جب تک اس نے ترکِ نسب نہیں کرا لیا اپنی بارگاہ میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ غزل صرف اپنے نسب کا احترام کرتی ہے۔ کافر آفاق میں گم ہو جاتا ہے۔ مومن میں آفاق گم ہوتے ہیں۔ اقبال کو غزل میں گم ہونا پڑا۔

بیسویں صدی میں شاعرِ مشرق کی پیغمبری اقبال اور ٹیگور کو تفویض کی اور مشرق کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس کا حق اس خوبی، خلوص اور خوبصورتی سے ادا کیا ہو جیسا کہ ان دونوں نے۔ جہاں اردو شاعری کا تعلق ہے کم از کم اس صدی کے بقیہ نصف میں شاید اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہ ہو البتہ اقبال کے تصرف سے ایک سے ایک ممتاز شاعر پیدا ہوتے رہیں گے ـــ بڑی شاعری اور بڑے شاعر کی یہ کھلی ہوئی نشانی ہے۔

(اقبال، شخصیت اور شاعری از رشید احمد صدیقی)

غزلیاتِ اقبال

(..... سنہ ۱۹۰۵ تک)

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیِ ناپایدار دیکھ

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی!

تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

کھنچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی!

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب!
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے؟

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

ہم اپنی دردمندی کا فسانہ
سُنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کیلئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کیلئے

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کیلئے

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و ملت سے تری
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کیلئے

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
ٹوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کیلئے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آہ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کیلئے

پاس تھا نا کامی صیاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کیلئے

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کیلئے

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟
اور اسیرِ حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا؟

جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا؟

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضہ طور پر
کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا؟

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
مرغِ دل دامِ تمنا سے رہا کیونکر ہوا؟

دیکھنے دل لے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا؟

حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا؟

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے آدردِ فراق!
چارہ گر دیوانہ ہے، میں لادوا کیونکر ہوا؟

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا؟
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا؟
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں اُن کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جلتے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہم نشیں!
پھر اور کس طرح انھیں دیکھا کرے کوئی

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی، سو میرے آشیاں تک ہے

وہ مشتِ خاک ہوں، فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسماں تک ہے

جرس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی، لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے رو کے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس، ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنّا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ انکو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تڑپتی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انھیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں؟

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَا عَرَفْنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب نازآفرینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلّانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبّت کے قرینوں میں
بُرا سمجھوں انھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنّت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا — وہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل — چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے — نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

بٹھلا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل
جہاں میں وا نہ کوئی چشم امتیاز کرے

غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں،
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی! خزف چینِ لبِ ساحل ہوں میں

ہے مری ذلّت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

بزمِ ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر، آپ ہی منزل ہوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
بسمل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو، اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بتخانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے!
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پہ مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

(سنہ ۱۹۰۵ء تا سنہ ۱۹۰۸ء)

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں!
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں!

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو، مگر
شمع بولی، گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں!

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم، تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں!

زائرینِ کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

ملا محبت کا سوز مجھکو، تو بولے صبحِ ازل فرشتے
مثالِ شمعِ مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفسِ میسّر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل!
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نزالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں، انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا!

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنّا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگارخانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنّا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں؟
تری نگاہوں میں تبسّم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم تراہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟

جو گھر سے اقبالؔ دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آرزو کا

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا، چاند میں، سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھکو
وہ سوداگر ہوں جس نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

سکوں ناآشنا رہنا اسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

یوں تو اے بزمِ جہاں! دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

کس قدر اے مے! تجھے رسمِ حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

مثالِ پرتوِ مے، طوفِ جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں!

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری
شجر، حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

نیا جہاں کوئی اے شمع! ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں

بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

بھلا نبھے گی نری ہم سے کیونکر اے واعظ!
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا!
کہ ایک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبالؔ
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

مارچ سنہ ۱۹۰۷ء

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ میخانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے بے وقار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا!

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ موروِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

جو ایک تھا اے نگاہ! تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا؟

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں!
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا!

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کاروں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ راہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا!

(سنہ ۱۹۰۸ء سے......)

اے بادِ صبا! کملی والے ﷺ سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دور وصالِ بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس! حجابِ محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

کی ترک تگ و دو قطرے نے، تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگی فطرت بھی گئی، اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے، کیا جانے کس کی ہے یہ صدا!
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے
باطنِ ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن بیہوش ہے

دہر کے غم خانے میں تیرا پتا ملتا نہیں
جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے؟

آہ! دنیا دل سمجھتی ہے جسے، وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے

زندگی کی رہ میں چل، لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خارِ بارِ دوش ہے

جس کے دم سے دلّی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ! اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زنّاریٔ بت خانۂ ایام ابھی

عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیٔ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشی شبنم کب تک؟ — مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب — مرے ساغر سے ہیں جھجکتے ہوئے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نوگرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر — چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک؟ — بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات — تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم! — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرّے سے تعمیرِ حرم! — دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا — ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر
پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے — پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

پھر بادِ بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
بر ہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو
تو جنسِ محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہوئے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو
اے رہروِ فرزانہ، رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو
ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گرِ ساماں ہو

۱۵۱

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

تہِ دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی
ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دلِ ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا، وہی آہِ نیم شبی رہی
نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیبِ دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللّٰہی، نہ کہیں ابولہبی رہی
مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں کہ نوا مری عربی رہی

گرچہ تو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر — آیۂ لا یُخْلِفُ الْمِیْعَادْ رکھ

یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے
"اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" یاد رکھ

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں!
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں!
گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

اگر کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب، لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

گیسوے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں!
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر!
تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بیکنار کر!
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر!

نغمۂ تو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر!

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد!
یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کریم ہے یا کہ ستم، تیری لذتِ ایجاد!
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل!
یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟
تصور وار، غریب الدیار ہوں، لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد!

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد!
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا!
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا!
وہ عشق، جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا!
میری بساط کیا ہے، تب و تابِ یک نفس!
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بیقرار کا!
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو!

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے!
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے!

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے!

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہ داری مرا ساحل نہ بن جائے!

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے!

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی!
دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی!

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی!
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی!

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی!

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آجائے مجھے تیرا مقام اے ساقی!

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی!
عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ!
نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب!
سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرَو!

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!
مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!
میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!
اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیٔ طینت سے ہے گہر کا وضو
جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو!

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی!
ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی!

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی!

گندا اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیانہ بندی!

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی!

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی!

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ!

یہ بُتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ محبت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ!
رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ!
مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ!
مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا!
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!
تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ!

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز!
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اُس نے فقیروں کو وارثِ پرویز!

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!
کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا!
تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز!
نہ چھین لذّتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!
دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز!
حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز!
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز!

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی!
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!
میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی!
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیسے رہ رسمِ شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی!
نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی!
کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی!

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں!
عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں!
کہہ گئیں رازِ محبّت پردہ دارِ یہلئے شوق!
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں!

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ بُرہانی حیرت کی فراوانی!
اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے، سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی!
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی!

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!
تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی!
تیرے بھی صنم خانے، میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی!

یا رب! یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند؟
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگِ گیاہے نہ دہی اہلِ خرد را
او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند!
احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند!
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند!
مدّت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند!
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی!
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند!
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند!
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند!
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند!
پُرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند!
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند!

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!
گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز!

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز!

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز!

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز!

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں!

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی!
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں!
عجب مزا ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں!
ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قارون، نہ فکرِ افلاطوں!
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں!
علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں!

عالمِ آب و خاک و باد! سیرِ عیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوزِ غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اسکی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر!
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

(لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہگذر میں ہے قیدِ مقام سے گذر!
مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر!
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر!

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گذر!
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر!
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر!

امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی!
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی!
نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں
نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی!
طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی!

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ رنگ و نم، یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی؟

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟
اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!
من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سُود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

(کابل میں لکھے گئے)

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا
شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!
بہت مدّت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا!

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا!
کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا!

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم!
اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم!
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
ہے عشق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!
وہ آنکھ کہ ہے سُرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!
کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے!
کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے!
بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے!

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث!
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق!
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات، کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق!
علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق!
مریدِ سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق!
اسی طلسمِ کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بُتانِ عہدِ عتیق!
ترے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر، کہ ملا ہیں صاحبِ تصدیق!

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق!

پوچھ اس سے مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی!
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی!
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی!
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی!

(قرطبہ میں لکھے گئے)

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغرباں جلوہ ہائے پا بہ رکاب!
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب!
جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رباب!
سکھا دئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب!
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!
سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب!
ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب!

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری!
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشانِ اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری!
اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لیجائیں تری قسمت کی چنگاری!
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری!
مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری!
تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری!

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی، تو بے لذّتِ نیاز نہیں
نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے!
شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں
سوالِ مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاکباز نہیں
بھلائی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
اک اضطرابِ مسلسل عیاں ہو، کہ حضور!
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں
اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف!
تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج، دیکھ چکا صدف صدف!
عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دَیر میں خونِ جگر نہ کر تلف!
کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف مرگِ حیات بے شرف!
صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف!
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَاتَخَفْ
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!

یورپ میں لکھے گئے

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی!
کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی
زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!
سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت، وہی عظمت، وہی شانِ دلآویزی!

یہ دیرِ کہن کیا ہے؟ انبارِ خس و خاشاک!
مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتشناک!

نخچیرِ محبّت کا قصّہ نہیں طولانی
لطفِ خلشِ پیکاں، آسودگیٔ فتراک!
کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملّت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک!
اک شرعِ مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سِرِّ فلکُ الافلاک!
اے رہروِ فرزانہ بے جذبِ مسلمانی
نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقیں نمناک!
رمزیں ہیں محبّت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ، ہر جذب نہیں بیباک!
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک!

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمھارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کیلئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری
سنے نہ ساقیٔ مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمیٔ صحبت ہے حرفِ معذوری
حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری!
وہ ملتفت ہوں تو کنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری
بُرا نہ مان، ذرا آزما کے دیکھ اسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری!

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں!

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تُو تو بے حضور نہیں

ہر گُہر نے صدف کو توڑ دیا
تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

اَرِنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیثِ کلیمؑ و طور نہیں!

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں!
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں!
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں
مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا
وہ پیرہن ہی مجھے بخش کہ پارہ پارہ نہیں!
غضب ہے عینِ کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں!

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبحگاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی!
تری زندگی اِسی سے، تری آبرو اِسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی!
نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
سبھی کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی!

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی!
یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو، تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی!
تو ہُما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی!
تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَا اِلٰہَ اِلَّا!
لُغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی!

تری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ!
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے میرے مقام سے آگاہ!
برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ!
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں!

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیاتِ سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں!

عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں!

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلۂ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے!

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے!
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے!
کسے نہیں ہے تمنّائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعرِ مرا کیا ہے شاعری کیا ہے!

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے
مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہداں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے
مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبریلؑ آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

تو اے اسیرِ مکاں! لامکاں سے دُور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں
عمل نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

یہی ہے خلاصۂ علمِ قلندری، کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں!
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اُٹھا، یہ مقام آسماں سے دور نہیں
کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو!
یہ بات راہروِ نکتہ داں سے دور نہیں

۸

یورپ میں لکھے گئے

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ!
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ!
نہ بادہ ہے، نہ صُراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ!
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!

کلی کو دیکھ، کہ ہے تشنۂ نسیم سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!
کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ!
فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ!
مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ!

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل، سوز و تب و تاب آخر!
میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر!

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل، دیتے ہیں شراب آخر!
کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں دفتر غرقِ مئے ناب آخر!
خلوت کی گھڑی گذری، جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر!
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

***

ہر شئے مسافر، ہر چیز راہی
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی!
تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی!
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی!
دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر، یا پادشاہی!
پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی!

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی!
بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی!
تارے آوارہ و کم آمیز — تقدیرِ وجود ہے جدائی!
یہ پچھلے پہر کا زرد رُو چاند — بے راز و نیازِ آشنائی!
تیری قندیل ہے ترا دل — تُو آپ ہے اپنی روشنائی!
اک تُو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں — باقی ہے نمودِ سیمیائی!

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی!

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ!
لوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ!
تعمیرِ آشیاں سے میں نے یہ راز پایا
اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ!

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ!

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ!

اے لَآ اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ!

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ!

رازِ حرم سے شاید اقبالؔ باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ!

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے!
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے!
اگر ہوتا وہ مجذوبِ[1] فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!
نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی!
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

---

[1] جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نیٹشے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔

نومید نہ ہو اِن سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی!
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی!

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا!
فدا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اِس جنگاہ سے میں بن کے تیرے نیام آیا!
یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا!

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے!
وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دورِ جام آیا!
دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا!
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا!

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی!
مجھے فطرت نوا پر سے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی!
وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی!
نہ کر افرنگ کا انداز اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی برّاقی!

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی!
خزاں میں بھی کب آسکتا تھا میں صیّاد کی زد میں
مری پرواز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی!
اُلٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی!

فطرت کو خرد کے روبرو کر — تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے — کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ — تو بھی مقامِ آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں — چاکِ گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اُس سے نہ ہو سکا وہ تو کر!

یہ پیرانِ کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!
صِلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!
یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی، کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!
کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری!
حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دُوری!
وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری!
کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری!
فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبالؔ آ گیا کیوں کر!
میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہینِ کافوری!

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم!
عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم!
عیشِ منزل ہے غریبانِ محبّت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم!
ہے گراں سیرِ غمِ را حلہ و زادے تو
کوہ و دریا سے گذر سکتے ہیں مانندِ نسیم!
مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم!

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں!
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں!

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

(فرانس میں لکھے گئے)

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنّائے خام! وائے تمنّائے خام!
پیرِ حرم نے کہا سُن کے میری روئداد
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام
تھا اَرَنِی گو کلیم، لَن اَرَنِی گو نہیں
اُس کو تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام!
گرچہ ہے افشائے راز اہلِ نظر کی فغاں
ہو نہیں سکتا کبھی شیوۂ رندانہ عام!

حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام!
عشق تری انتہا، عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام!
آہ! کھو گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام!

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل!
عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!
فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل!
نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل!

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذّت کہاں حجابِ دلیل!
اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ!

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اسرار بھی ہے؟
منزلِ رہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِؑ کرّار بھی ہے
علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے
لذّتِ شوق بھی ہے، نعمتِ دیدار بھی ہے

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ
سُست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے!
یا مری آہ میں کوئی شررِ زندہ نہیں!
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے!
کیا عجب! میری نواہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے!
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی!
خراب کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلّےٰ کمال زرّاقی!
کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز
کتابِ صوفی و ملّا کی سادہ اوراقی!
نہ چینی و عربی نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی!
مئے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن
کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی!
چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی!
عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوزِ و برّاقی!

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
مئے یقیں سے ضمیر حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک!
عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک!
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک!
تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک!
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک!
جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک!

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ!
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!
یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ!
یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ!
یا عقل کی روباہی یا عشقِ یدا للّٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ!
یا شرعِ مسلمانی یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بتخانہ!
میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ!

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لَاَاِلٰہ میں ہے!
یہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے!
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے!
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے!
تلاش اُس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبحگاہ میں ہے!
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک!

وہ خاک، کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک، کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک!
وہ خاک، کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک!
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک!

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد!
یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد!
نہ فلسفی سے نہ ملّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد!
فقیہہ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد!

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد!
کیے ہیں فاش، رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد!
رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد!

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی!
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی!
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی — جیتا ہے رُومی، ہارا ہے رازی!
روشن ہے جامِ جمشید اب تک — شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی!
دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا — تو بھی نمازی، میں بھی نمازی!
میں جانتا ہوں انجام اُس کا — جس معرکے میں ملّا ہوں غازی!
ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں — حرفِ محبّت، تُرکی نہ تازی!
آذر کا پیشہ خارا تراشی — کارِ خلیلاںؑ خارا گدازی!

تو زندگی ہے پائندگی ہے
باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی!

گرمِ فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ!
وائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ!
تیری طبیعت ہے اور، تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ!
دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ!

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ
تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی!
دیا ہے میں نے انھیں ذوقِ آتش آشامی!
حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی!
حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؑ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی!
مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی!
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنید رحؒ و بسطامی رحؒ!

قبائے علم و ہنر لطفِ خاص ہے ورنہ
تیری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی!

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسّر ہوا ہے بے تگ و دو
نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو
نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو
پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ سازگار نہیں یہ جہانِ گندم و جو
رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسروا

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش!
کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش!
میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں!
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!
نئی تہذیب تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش!
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش!

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج اِن خانقہوں میں ہے فقط روباہی!
نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہیدِ کلیم اللّٰہی!

لذّتِ نغمہ کہاں مرغِ خوش الحاں کے لئے
آہ! اِس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی!
ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک!
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی!
صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی!

سہے یا دب مجھے نکتہ سلمانِ[1] خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ!

---

[1] سلمان، مسعود و سعد سلمان غزنوی دور کا نامور ایرانی شاعر جو غالباً لاہور میں پیدا ہوا تھا۔

کر بلبُل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبُل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
عِلم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفّتِ قلب و نگاہ
عِلم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
عِلم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ!
علم کا 'موجود' اور، فقر کا 'موجود' اور
اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰه، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰه
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
اِک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ!

کمالِ جوششِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرؔ و غلاف!
تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف!
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف
سُرور و سوز میں ناپائیدار ہے ورنہ
مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف!

شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب
مقامِ شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب!

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب!

اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف
مری نوا میں نہیں طائرِ چمن کا نصیب!

سُنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سُنائے کون اُسے اقبال کا یہ شعرِ غریب!

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ترا بحر پر سکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ!

تو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ!
ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ!
نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسّر مری شوخیٔ نظارہ!

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور!
معجزۂ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طور!
مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں، گرمیٔ یوم النشور!
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور!

فیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور
خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور!

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی!
تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی!
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تدرواں نہیں دینِ شاہبازی!
ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسمِ کارسازی!
نہ جدا رہے نوا گر تو تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیِ امم ہے یہ طریقِ نے نوازی!

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ!
میسّر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کیلئے جہاں میں فراغ!
فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ!
وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس!
چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ!
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ!

دریا میں موتی! اے موجِ بیباک!
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک!
میرے شرر ہیں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک!

تیرا زمانہ، تا شیر تیری!
ناداں! انہیں یہ تا شیر افلاک!
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک!
کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منّتِ تاک!
رکھتا ہے اب تک میخانہ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک!
اہلِ نظر ہیں یورپ کے نومید
ان اُمّتوں کے باطن نہیں پاک!

خیابان پبلی کیشنز بمبئی کی زیر طبع کتابیں

۱۔ **تغزل** ——— ایک سو پچاس سے زائد شعراء کرام
کی غزلوں کا انتخاب

۲۔ **کشمکش** ——— باقر مہدی کے تنقیدی مضامین

۳۔ **انتخاب کلامِ راجہ مہدی علی خاں**

خیاباں پبلی کیشنز
۱۰۵۔ نشان پاڑہ روڈ، دوسرا منزلہ
بمبئی ۴۰۰۰۰۹